وحیدالدین سلیم

بزمِ سرور میں علامہ اقبال اور مودودی

پروفیسر آل احمد سرورؔ (مرحوم) اردو شعر و ادب اور تنقید میں ایک معروف و ممتاز نام ہے۔ اُنھوں نے ایک طویل مضمون ''اردو میں دانش وَری کی روایت'' کے موضوع پر برسوں قبل لکھا تھا۔ موضوع نہایت چونکا دینے والا ہے، اس کی اسی خصوصیت کی بناء پر روز نامہ ''منصف'' کے ہفتہ وار ادبی کالم ''ایوان ادب'' میں بالاقساط شائع کیا گیا۔ اس میں اردو کے کئی نامور ادیبوں کے افکار کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ خاص طور پر علامہ اقبال اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پر سرور صاحب کی آزادانہ خامہ فرسائی کو پڑھتے ہوئے غالب کا یہ مصرعہ بار بار زبان پر آتا رہا کہ:

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ

یوں تو اس پورے مضمون پر ہی تنقید لکھی جانی چاہیے لیکن یہاں صرف علاّمہ اقبال اور مولانا مودودی کی شخصیات پر فرمُوداتِ سرور کا جائزہ لیا جائے گا۔ اقبال اور مودودی کے افکار، افکارِ عالم کی جدید تاریخ کا قیمتی حصہ ہیں اور ادب، فلسفہ اور عمرانیات میں ضیائے سحر کی طرح فروغ پذیر بھی۔ ان اکابر کے متعلق کوئی غلط بات لکھ دی جائے تو وہ لاکھوں قُلوب کو مضطرب کر دیتی ہے۔

علاّمہ اقبال کے متعلق سرور صاحب نے لکھا ہے:

> اقبال کے یہاں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ ختم نبوت نے آنے والے انسانوں کے لیے لامحدود آزادی اور امکانات کا دروازہ کھول دیا، کیونکہ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا اور انسانوں کو اب اس کی ضرورت نہ رہی۔ اس سے اقبال نے رسول اللہؐ کی وحی کی روح کو اس کے ظاہری تفصیلات سے زیادہ اہمیّت دی اور رسول اللہؐ کی شخصیت کی جامعیّت کو انسانوں کے لیے ایک نمونہ اور آئیڈیل قرار دیا[۱]۔

یہ انتہائی غیر محتاط طرزِ نگارش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکمیل دین اور ختم نبوت کا اعلان کر دیا گیا، اسی بناء پر نزولِ وحی کی اب ضرورت باقی نہیں رہی لیکن انسانوں کی ہدایت کے لیے وحی کی ضرورت بہ شکلِ قرآنِ مجید محفوظ کر لی گئی ہے۔ اب قیامت تک قرآن سرچشمۂ ہدایت رہے گا۔

علاّمہ اقبال کی کیا مجال کہ وحی کی رُوح کو اس کے ظاہری تفصیلات سے زیادہ اہمیت دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کی جامعیّت ختم نبوّت کا لازمی تقاضا ہے اور قرآن مجید نے آپؐ کی ذاتِ اقدس کو اسوۂ حسنہ (Ideal) قرار دیا ہے اور اب یہ تمام مسلمانوں کا ایمان ہے۔ علامہ اقبال ان ہی عقائد کے

ترجمان تھے۔

سرور صاحب آگے لکھتے ہیں:

لیکن یہ بات بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ تغیر و تبدل پر ایمان کے باوجود اور تاریخی ضروریات کو ملحوظ رکھنے کے باوجود جدید دور کی بعض قدروں مثلاً جمہوریّت اور قومیّت اور سائنسی نظریات کے ساتھ اقبال نے انصاف نہیں کیا۔ اقبال نے جمہوریّت، قومیّت، سائنس اور صنعت و حرفت کی خرابیوں پر تو نظر رکھی مگر ان کے روشن پہلوؤں، ان کی طاقت اور ان کے امکانات کو مناسب اہمیت نہ دی[۲]۔

اقبال نے جمہوریّت، قومیّت، سائنس و صنعت و حرفت پر جا بجا تنقید ضرور کی ہے لیکن ان کی حقیقت اور ضرورت سے کہیں انکار نہیں کیا۔ ان اداروں اور شعبوں میں اگر بگاڑ پیدا ہو جائے تو ان پر تنقید ضروری ہے اور اقبال کی تنقید بڑی گہرائیاں رکھتی ہے۔ اقبال نے جمہوریّت کے مقابلے میں ملوکیّت کو کبھی اہمیّت نہیں دی کیونکہ اگر وہ قومیّت، رنگ، نسل اور جغرافیائی حدود میں نوع انسانی کو تقسیم کر دے تو یہ اس کی فتنہ سامانی ہے۔ اگر یہ صرف تعارف باہمی کے لیے کام کرے تو اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اقبال نے سائنس اور صنعت و حرفت پر بھی تنقید کی ہے، وہ ان علوم و فنون کی افادیّت کے خلاف نہیں ہے۔ اقبال انسانی ترقی اور فلاح کے لیے روحانی مراتب کو طے کرنا ضروری سمجھتے تھے، اور انسانیت کو مادیّت کی زد سے بچانے کے خواہشمند تھے کیونکہ بے محابا مادی عروج کا راستہ سرکشی اور دہریّت کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر مادی طاقتیں بے توفیق قوموں کے ہاتھ میں آ جائیں تو یہ دنیا درندوں کی بستی بن جائے گی۔ آج سائنسی فکر کو بھی اقبال جیسے عظیم فلسفی سے ہدایت پانے کی ضرورت ہے۔ مشہور سائنس دان اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر رضی الدین صدیقی لکھتے ہیں کہ:

اقبال ایسی عقل کے قائل ہیں جو نسیم کی مانند سیر چمن ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ گُل و نَسرین کے رگ و ریشہ میں داخل ہو کر ان کا مطالعہ کرے۔ جو نہ صرف دنیا و مافیہا کے متعلق قیاس آرائی کرتی رہے بلکہ آں سُوئے افلاک بھی منظر دوڑائے اور جس کے خمیر میں فرشتوں کا نور اور انسانوں کا سوزِ دل شامل ہو[۳]۔

سرور صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

اقبال کو اتنا احساس تو تھا کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو، وہاں قومیّت اور اسلام ایک دوسرے سے مطابقت پیدا کر لیتے ہیں مگر انھیں یہ خیال نہ رہا کہ قومیت کے اثرات وہاں بھی ناگزیر ہیں، جہاں مسلمان اقلیّت میں ہیں[۴]۔

قومیت کی بنیادی اہمیت سے بھلا اقبال کو کیسے اختلاف ہو سکتا ہے۔ کیا اقبال نے، ایران، ترکی، عربی اور امریکی پاسپورٹ پر ہندوستانی شہریّت کے حقوق کی وکالت کی ہے؟ اقبال پر سرور صاحب کا یہ ایک مضحکہ خیز اعتراض ہے۔ سرور صاحب اسلام اور قومیت کے مسئلے پر مزید ارشاد فرماتے ہیں کہ

''مولانا آزاد کا خیال غلط نہ تھا کہ اسلام اور قومیّت میں کوئی تضاد نہیں اور مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک اُمّتِ واحدہ بنا سکتے ہیں۔ اقبال اس خیال کے مخالف تھے[۵]۔

اگر مولانا آزاد کے اس خیال کو رہنمائی کی حیثیت سے قبول کر لیا جا سکتا تو ہماری رائے یہ ہے کہ صرف مسلمان اور ہندوستان کے غیر مسلموں کے ساتھ ہی کیوں ایک اُمّتِ واحدہ بنائیں؟ کیوں نہ مسلم، ہندو اور برطانوی عیسائی مل کر اُمّتِ واحدہ بنائیں؟ اس فارمولے پر عمل کیا جاتا تو ہندوستان کو آزادی کامل کے لیے جدوجہد کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ یہاں اُمّت کا لفظ بے محل طریقے پر استعمال کیا گیا ہے۔ اُمّت اور قوم کے الفاظ اپنے اندر جُدا جُدا مفہوم رکھتے ہیں۔ حضرت علاّمہ نے اس خیالِ خام کا اپنے ایک معرکہ آرا مقالے ''جغرافیائی حدود اور مسلمان'' میں بڑا مثبت جواب دیا ہے کہ:

> حضور رسالت مآبؐ کے لیے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کُفّارِ مکّہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو، مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بناء پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے، ایک وحدت عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر حضورؐ نعوذ باللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی لیکن نبی آخر الزماںؐ کی راہ نہ ہوتی[۶]۔

سرور صاحب اس مضمون میں آگے لکھتے ہیں کہ:

> اسلام ایک مذہب ہے اور عالم گیر مذہب ہے۔ یہ قومیّت سے ہی ماورا ہے اور بین الاقوامی نظر رکھتا ہے۔ مگر تاریخ اسلام یہ بتاتی ہے کہ اسلام نے قومیّت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ دراصل اس معاملے میں مولانا آزاد اور اقبال دونوں اپنی انا کے شکار ہوئے[۷]۔

یہاں سرور صاحب کو اقبال اور آزاد کے نظریات و اقدامات کے سمجھنے میں ٹھوکر لگی ہے۔ اس معاملے میں نہ اقبال اپنی انا کے شکار ہوئے اور نہ آزاد اپنی انا کے اسیر۔ دونوں نے تاریخ کا مُطالعہ کیا ہے۔ اقبال نے تاریخ کے مُطالعے میں تخیّل کے ساتھ تجربے کو بھی حاصل کیا لیکن آزاد نے تاریخ کے مُطالعہ سے صرف تخیّل اَخذ کیا۔ اس بناء پر دونوں کی راہیں علیحدہ علیحدہ ہو گئیں۔

سرور صاحب اپنے خیالات کی پُر پیچ راہوں سے گزر کر آخر میں ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اقبال پاکستان کے نظریہ ساز نہیں تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

> اقبال نے دراصل کمال اتاترک سے بڑی اُمیدیں وابستہ کی تھیں مگر وہاں کی لادینی طرزِ حکومت سے گھبرا کر اُنہوں نے یہ سوچا اگر ہندوستان میں ان علاقوں کی نئی تنظیم ہو جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں تو ان علاقوں کے ذریعے سے اسلام کی خدمت اور ہندوستان کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ اقبال کو پاکستان کے نظریے کا خالق کہنا میرے نزدیک صحیح نہیں[۸]۔

برّصغیر میں مسلمانوں کے لیے ایک آزاد مملکت کا حصول اقبال نے کسی ردِّعمل کے طور پر ضروری نہیں سمجھا، اُن کا نظریۂ مملکت یا نظریۂ پاکستان اسلام اور اُمّتِ اسلامیہ کی حیاتِ اجتماعیہ کی تشکیل و تعمیر کے طور پر تھا۔ اقبال شروع سے انقلابِ اسلامی کے نقیب رہے ہیں اور اسی میں وہ انسانیت کی بقا و نجات کو مضمر پاتے

تھے۔ سرور صاحب ہی کے خط کے جواب میں اُنھوں نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

> میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانہ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہوسکتی ہے۔ میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائقِ اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ اگر آپ پورے غور و توجہ سے یہ مطالعہ کریں تو ممکن ہے کہ آپ انھیں نتائج تک پہنچیں جن تک میں پہنچا ہوں[۹]۔

سرور صاحب نے یہ مضمون لکھ کر ثابت کر دیا کہ انہوں نے علاّمہ اقبال کے مشورے پر عمل نہیں کیا، چنانچہ اس دور کے امراض ذہنی تشکیک و تذبذب سے وہ کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ اقبال خطبۂ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء سے اپنے منصوبے کی سمت آگے بڑھتے رہے اور انتقال سے قبل بانگ دُہل اُنھوں نے اس حقیقت کا اظہار کر دیا تھا کہ:

> نبوت محمدیہؐ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو، جو نبوت محمدیہؐ کو بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، ان کو اُن تمام آلودگیوں سے مُنزّہ کیا جائے جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیّل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیّت سے ہمکنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدیؐ، یہ ہے نصب العین ملّتِ اسلامیہ[۱۰]۔

یہ کائناتی حقیقت، شاعر، فلسفی اور سیاست داں اقبال کی فکر کا محور بنی اور وہ دم آخر تک اس راہ پر گام زن رہے۔ اس بناء پر ''ہندو پاک میں اسلامی جدیدیت'' کے مصنف عزیز احمد کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ:

> ہندوستانی سیاست کے متعلق بالآخر اقبال اسلامی ریاست کے نظریہ ساز بن کر اُبھرتے ہیں اور اس کے برعکس آزاد متحدہ اور مخلوط قومیت کے طرف دار ہیں[۱۱]۔

جدید تاریخ عالم پر سرور صاحب کی نظر کس قدر سطحی ہے؟ اُن کی درج ذیل تحریر سے آشکار ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

> اقبال کا یہ سمجھنا کہ یورپ کی تہذیب خودکشی کی طرف جا رہی ہے، بہ ظاہر اہلِ مشرق کے لیے دل خوش کن معلوم ہوتا ہے، مگر یورپ اپنے پیدا کردہ مرض کا علاج کر بھی سکتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کا مرض زیادہ خطرناک ہے۔ اُنہوں نے ترقی یافتہ ممالک کا نسخہ آزمایا ہے مگر اُن کے پاس وہ انسانی وسائل اور وہ باصلاحیت ادارے نہیں ہیں جو اُن کے مسائل کو حل کر سکیں۔ اقبال کا نسخہ مرض کی تشخیص میں ضرور مدد دیتا ہے مگر علاج کے لیے اتنا کارگر نہیں معلوم ہوتا[۱۲]۔

یورپ کی تہذیب اور وہاں کے مسائل پر علاّمہ اقبال کی تنقید اُن کی اسلامی نظر کا فیضان ہے۔ سرور

صاحب کے پاس جو پیمانہ ہے، وہ خود یورپ کا ہے۔ بھلا مریض کے پیمانے سے مرض کی تشخیص کیسے کی جا سکے گی؟ اقبال یورپی معاشرے اور تفکر کا گہری نظر سے جائزہ لے چکے تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یورپ اپنے مرض کا علاج کرنے سے عاجز ہے۔ اُس کے نظریات کا سرمایہ، حیات و کائنات کی حقیقتوں کے شعور و ادراک میں مدد بہم پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چونکہ مشرقی اقوام آزادی حاصل کر کے ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے مرحلے میں تھیں، اُنہیں یہ اندیشہ ہوا کہ یہ یورپ کی تقلید کا شکار ہو کر اپنا توازن کہیں نہ کھو دیں حالانکہ انسانیّت کو درپیش مسائل کا حل اُن کے پاس ہے۔ وہ قرآن مجید کو سارے امراضِ انسانی کا نسخۂ شفا سمجھتے تھے، اس طرح اقبال نہ صرف مشرق کے مُحسن بلکہ مغرب کے بھی رہنما و بہی خواہ تھے۔

متذکرہ عبارت میں جناب سرور نے اقبال پر طعنہ زنی بھی کی ہے اور اُن کی دانشوری پر ضرب بھی لگائی ہے، حالانکہ یورپ پر اقبال کی تنقید کی روشنی میں ایک جدید تاریخ یورپ لکھی جا سکتی ہے لیکن یہ کسی مردِ آزاد کا کام ہے ورنہ سرور صاحب کی کاوش نظر پر کیا عجب ہے کہ روح اقبال تڑپ اٹھی ہو اور کہہ رہی ہو کہ:

ترا وجود سراپا تجلّیِ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی، خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زر نگار و بے شمشیر

علاّمہ اقبال کے بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی انقلابی افکار میں بزمِ سرور کی دوسری عالمی شخصیت ہیں۔ حضرت علاّمہ کی دعوت پر مولانا مودودی کی حیدرآباد دکن سے پنجاب میں منتقلی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> یوں بھی اقبال کی ساری تصانیف اور خطوط کے مطالعے کے بعد ہم نہیں کہہ سکتے کہ اقبال، مودودی کے خیالات سے اتفاق رکھتے تھے۔ ہاں وہ مولانا کی علمیت، ان کے اسلوب کے زور بیاں اور اسلام کے لیے ان کے درد کے ضرور قائل رہے ہوں گے[۱۳]۔

علامہ اقبال کو جس چیز نے مولانا مودودی کا ہم خیال بنا دیا وہ اسلامی قانون کی تشکیل جدید کا موضوع تھا۔ انقلابِ اسلامی کے لیے اقبال اس کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ اقبال نے اس منصوبے میں کئی اور علماء کو اپنا شریک کار بنانے کی کوشش کی تھی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر اُنھوں نے مولانا مودودی سے خط و کتابت کی چنانچہ مولانا نے اس دعوت کو قبول کیا۔ اقبال کے خطوط مولانا مودودی کے پاس مسلسل نقل مکانی کے سبب محفوظ نہ رہ سکے اور مولانا کی پنجاب منتقلی کے جلد ہی بعد اقبال کا انتقال ہو گیا۔ تاہم اقبال اور مودودی کے درمیان تعلقات میں کیسی ہم آہنگی تھی؟ اس کی ایک جھلک مولانا اور پروفیسر نذیر نیازی کے درمیان جو مراسلت ہوئی تھی، اُس میں دیکھی جا سکتی ہے، یہاں چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔ مولانا مودودی، پروفیسر نذیر نیازی کے جواب میں ایک طویل خط لکھتے ہیں۔ اس کے یہ آخری دو جملے دیکھیے کس قدر اہم ہیں۔

> علامہ اقبال کے ساتھ عمر انیاتِ اسلامی کی تشکیل جدید میں حصہ لینا میرے لیے موجبِ سعادت

ہے۔ میں ہر ممکن خدمت کے لیے حاضر ہوں، مگر اس سلسلے میں کسی مالی معاوضہ کی مجھے ضرورت نہیں''۔ خاکسار: ابوالاعلیٰ۔ ۲۶/جولائی ۱۹۳۷ء۔ حیدرآباد دکن۔

مولانا مودودی پٹھان کوٹ کے قریب چودھری نیاز علی خان کے گاؤں (جہاں دارالاسلام کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا) منتقل ہو چکے تھے اور ابھی لاہور جا کر علاّمہ سے ملاقات نہ کر سکے تھے، پروفیسر نذیر نیازی نے علاّمہ کی خرابیِ صحت سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

> کچھ دن ہوئے سید محمد شاہ صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ جمال پور تشریف لے آئے ہیں اور عنقریب لاہور بھی آئیں گے۔ اُس وقت سے برابر آپ کا انتظار ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اگر آپ کا ارادہ فی الواقعہ لاہور آنے کا ہے تو جلدی تشریف لائیے تا کہ ملاقات ہو جائے۔ اپنی طرف سے یہ گزارش ہے کہ ڈاکٹر صاحب قبلہ کی حالت نہایت اندیشناک ہے۔
>
> آپ کا مخلص: نیازی ۱۸/اپریل ۱۹۳۸ء

اسی اثنا میں علاّمہ اقبال کی رحلت کا وقت آ گیا اور مولانا کی ملاقات نہ ہو سکی۔ نذیر نیازی کے نام مولانا نے خط لکھا اور حضرت علاّمہ کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کا اس طرح اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> میں اپنے وعدے کے مطابق آنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ یکا یک علاّمہ کے انتقال کی خبر پہنچی، دفعۃً دل بیٹھ گیا۔ سب سے زیادہ رنج مجھے اس بنا پر ہوا کہ کتنا قیمتی موقع میں نے کھو دیا۔ آپ کے عنایت نامے سے مجھے صحیح اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ وقت اس قدر قریب آ گیا ہے۔ اگر معلوم ہوتا تو سب کام چھوڑ کر فوراً پہنچتا۔ میں اس کو اپنی انتہائی بدنصیبی سمجھتا ہوں کہ اُس شخص کی آخری زیارت سے محروم رہ گیا جس کا مثل شاید اب ہماری آنکھیں نہ دیکھ سکیں گی۔
>
> محمد علی کے بعد یہ دوسرا نقصانِ عظیم مسلمانوں کو پہنچا ہے اور یہ نقصان میری نگاہ میں پہلے نقصان سے عظیم تر ہے۔ کچھ خبر نہیں کہ اللہ کو کیا منظور ہے۔ بظاہر تو ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ مسلمان قوم کو اس کی ناقدری و نااہلی کی سزا دی جارہی ہے کہ اس کے بہترین آدمی عین اُس وقت پر اٹھا لیے جاتے ہیں جب ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اب سارے ہندوستان پر نگاہ ڈالتا ہوں تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کی طرف ہدایت حاصل کرنے کے لیے رجوع کیا جا سکے۔ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے، ایک شمع جو ٹمٹما رہی تھی وہ بھی اُٹھا لی گئی۔
>
> مجھے جو چیز پنجاب کھینچ لائی تھی وہ دراصل اقبال ہی کی ذات تھی۔ میں اس خیال سے یہاں آیا تھا کہ ان سے قریب رہ کر ہدایت حاصل کروں گا اور اُن کی رہنمائی میں جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا اسلام اور مسلمانوں کے لیے کروں گا۔ اب میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ میں طوفانی سمندر میں بالکل تنہا رہ گیا۔ دل شکستگی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی ہے۔ صرف اسی خیال سے اپنے دل کو ڈھارس دے رہا ہوں کہ اقبال مر گئے تو کیا ہوا خدا تو موجود ہے۔
>
> برادرم، آپ آخر وقت تک علاّمہ کے ساتھ رہے ہیں۔ اگر میری ہدایت کے لیے انہوں نے کچھ

فرمایا ہو تو مجھے ضرور اس سے مطلع کریں۔

خاکسار: ابوالاعلیٰ، دارالاسلام۔ پٹھان کوٹ۔۲۳/اپریل ۱۹۳۸ء

(مولانا مودودی اور نذیر نیازی کے خطوط کے اقتباسات ''وثائق مودودی'' لاہور سے اخذ کیے گئے ہیں)

علاّمہ اقبال کے انتقال کے وقت مولانا کی عمر صرف ۳۵ سال تھی یعنی علاّمہ سے تقریباً نصف کے برابر تھی لیکن عمروں کے اس تفاوت کے باوجود اسلام کی نشاۃ جدیدہ کے لیے دونوں کے زاویہ ہائے نظر یکساں تھے۔ مولانا مودودی نے اپنے انقلابی مقاصد کے لیے حیدر آباد سے رسالہ ''ترجمان القرآن'' جاری کیا اور ''الجہاد فی الاسلام'' جیسی عظیم کتاب اُنھوں نے صرف ۲۴ برس کی عمر میں لکھی۔ اس کے علاوہ اوائل عمر ہی میں انھوں نے مختلف موضوعات پر کئی اہم مقالات لکھے جو دنیائے علم وفکر میں رہنمائی کا ذریعہ بنے۔ اسلامی تعلیم و تربیت اور تحقیق کے لیے وہ خود حیدر آباد میں ایک ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے زمین بھی لے رکھی تھی۔ اگر علاّمہ کی دعوت پر پنجاب نہ بھی جاتے تو وہ بڑے صاحب عزیمت انسان تھے، حیدر آباد ہی سے دعوتِ دین کی تحریک کا آغاز کرتے۔ کسی مادی منفعت کے بغیر حیدر آباد جیسے ترقی یافتہ شہر میں اپنی جمی جمائی زندگی کی بساط کو لپیٹ کر مولانا کے پنجاب کے ایک گاؤں میں جا بسنے میں علاّمہ اقبال کے ساتھ افکار و اہداف میں ہم آہنگی کے سوا اور کیا چیز محرک ہو سکتی تھی؟ سرور صاحب نے مناسب علم و آگہی کے بغیر مولانا مودودی کو موضوع سخن بنانے کی کوشش کی۔

سرور صاحب کا یہ عامیانہ ریمارک ملاحظہ کیا جائے، وہ لکھتے ہیں کہ:

مولانا مودودی کی تفہیمات اور تنقیحات اور دوسری تصانیف کا غائر نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ مولانا دانشور نہیں کہے جا سکتے۲۔

دانشور کیوں نہیں کہے جا سکتے؟ دلائل ملاحظہ ہوں، اُن کی پہلی دلیل یہ ہے۔

وہ عقل پر اعتماد نہیں کرتے اور بہت سے سوالات صرف عقیدے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

ہم یہاں ایک ایک دلیل کا مختصر جائزہ لیتے چلیں تاکہ قارئین کو ان کا کھوکھلا پن معلوم ہو سکے۔ زندگی کے جو مسائل ماورائے عقل ہوں اُن کو عقیدے کے حوالے کیے بغیر چارہ کار ہی نہیں۔ عقیدے کے متعلق سرور صاحب کا ذہن تاریک نظر آتا ہے۔ اسلامی عقیدہ کسی وہم و گمان کا نام نہیں، اس کی اساس حقائق ابدی پر ہوتی ہے اور یہ خدا اور رسول پر ایمان کے ذریعے ضمیرِ آدم پر منکشف ہوتا ہے۔ مسائل کے ہجوم میں جہاں عقل ناکام ہو جاتی ہے، وہاں عقیدہ انسان کو سہارا دیتا ہے۔

دوسری دلیل ملاحظہ ہو:

مولانا اسلام اور اسلام کی تاریخ میں فرق نہیں کرتے۔ مولانا اسلامی تعلیمات پر ہی نظر رکھتے ہیں۔

اس دلیل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سرور صاحب نے مولانا کی تصانیف کا سرسری سا بھی مطالعہ نہیں کیا، بلاثبوت انھوں نے اپنی یہ رائے لکھ دی۔ مولانا ایک داعی اسلام تھے، اگر انھوں نے اسلامی تعلیمات ہی کو پیش کیا تھا تو اس میں خرابی کیا ہے؟

تیسری دلیل میں سرور صاحب کا ارشاد توجہ کے قابل ہے۔

(مولانا) اسلامی تہذیب کے شاندار سرمائے کو جس میں تصوف کے اثرات، فنِ تعمیرات کے کمالات، خوش نویسی کے نقش ونگار سبھی شامل ہیں قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

مولانا مودودی نے تجدید واحیائے دین کے مشن میں اپنی پوری زندگی جھونک دی تھی۔ وہ جن مسائل اور مہماتِ زندگی سے نبرد آزما تھے، وہ اتنی فرصت کہاں دیتے تھے کہ معاشرت کے ایک ایک جزو پر مفصل کام کیا جائے۔ وہ تو اس بساط زمانہ کو اُلٹ کر نئی بساط بچھانے میں لگے ہوئے تھے۔ وہ بھلا ثقافتی اُمور پر کیسے توجہ دے سکتے تھے۔ سرور صاحب نے تصوّف فنِ تعمیر اور خُوش نویسی کو اسلامی تہذیب کا سرمایہ قرار دیا ہے حالانکہ یہ تمدنی وثقافتی معاملات ہیں۔ تہذیب وثقافت میں نازک فرق پایا جاتا ہے، جس کو سمجھے بغیر ہی اُنھوں نے مولانا کو موردِ الزام قرار دیا ہے۔ افسوس کہ سرور صاحب کی کم نظری بھی ادب وتنقید کے میدان میں ہنر بن گئی۔

سرور صاحب کی چوتھی دلیل کی حقیقت کیا ہے، دیکھتے چلیں۔

وہ (مولانا) مغرب، مغربی تہذیب، عقلیت، سائنس، صنعت وحرفت اور جمہوری اداروں کے صرف تاریک پہلو دیکھتے ہیں۔ وہ وکیل ہیں، مفکر نہیں۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ صرف مولانا مودودی ہی نہیں، کوئی بھی داعی اسلام، جن ذرائع سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے، اُن کو روکنے کی لازماً کوشش کرے گا۔ مغربی تہذیب اور عقل پرستی پر تنقید کیے بغیر ایک صالح معاشرے کی تعمیر کیسے ممکن ہے؟ مولانا نے صرف تنقید ہی نہیں کی تھی بلکہ اسلامی زندگی کی حقیقتوں سے دنیا کو واقف کرانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے تنقیدِ مغرب میں وکیل کا فریضہ انجام دیا اور تعمیر مشرق میں ایک مفکر کا کردار ادا کیا ہے۔ ان حقائق کو کوئی کور ذوق نقّاد کیسے قبول کر سکتا ہے۔

آج کل دنیا کے جمہوری اداروں کی کیسی بُری حالت ہے؟ ان کی جتنی خرابیاں گنوائی جائیں کم ہیں، صرف نام کی جمہوریتوں سے انسانوں کو کیا راحت مل سکتی ہے، مولانا مودودی نے فی نفسہٖ جمہوریت کی کبھی مخالفت نہیں کی بلکہ اُنہوں نے جمہوریت کی صحت وسلامتی کے لیے اپنی سیاسی پارٹی ''جماعت اسلامی'' کے ذریعے پاکستان میں نہایت گرانقدر خدمات انجام دیں۔

جہاں تک سائنس اور صنعت وحرفت کی بات ہے، مولانا مودودی نے ان علوم وفنون کے حصول کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ انہوں نے ۲۱ رسال کی عمر میں ایک معرکہ آرا مقالہ ''ہندوستان کا صنعتی زوال اور اُس کے اسباب'' کے موضوع پر لکھا تھا اور یہ اُس وقت کے مشہور رسالے ''نگار'' کی تین اشاعتوں (اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۴ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالے کی اشاعت میں صاحب ''نگار'' نیاز فتح پوری نے جو بددیانتی کی تھی، وہ مولانا مودودی کے ایک مکتوب کی اشاعت سے نظر پڑ گئی ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ:

> میں نے ایک نہایت مفصل مضمون اُن معاشی نقصانات پر لکھا تھا جو انگریزی حکومت نے ہندوستان کو پہنچائے تھے، وہ میرے مہینوں کی محنت ومشقّت کا نتیجہ تھا۔ اس کی پہلی قسط جب ''نگار''

میں نیاز صاحب کے نام سے شائع ہوئی تو میں نے اس پر سخت احتجاج کیا، تب باقی قسطیں میرے نام سے چھپیں۔

(مکاتیبِ سید ابوالاعلیٰ مودودی حصہ دوم۔ مکتوب نمبر ۲۲۱۔ مرتبہ عاصم نعمانی)

مقام حیرت ہے کہ نیاز فتح پوری جیسے سارقِ علمی (Plagiarist) کو سرور صاحب نے دانشور ادیبوں کی فہرست میں شامل کیا ہے، کم علمی و بے دانشی کی اس سے بڑھ کر کیا مثال پیش کی جائے؟

سرور صاحب کے سلسلۂ کلام کا پانچواں نکتہ یہ ہے۔

وہ ایک اہم مصنف ہیں اور ایک خاص اسلوب کے مالک ہیں جو برنارڈ شا کی طرح پر جوش ادعا (Effectivness of Assertion) رکھتا ہے۔ مگر تاریخ، تہذیب اور فلسفے پر ان کے افکار میں گہرائی نہیں ہے، جس کی ہم ایک دانشور سے توقع رکھ سکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ تاریخ، تہذیب و فلسفے میں مولانا کی نگارشات کی داد کوئی صاحب نظر، فاضل ہی دے سکتا ہے۔ اُن کا اسلوب سادہ لیکن نہایت سلجھا ہوا ہوتا ہے۔ مضمون پر قدرت اور اُس کے اظہار کی خوبی یہ ہے کہ وہ مشکل سے مشکل موضوعات کو بھی آسان سے آسان پیرایے میں بیان کر جاتے ہیں۔ یہ اُن کا اعجاز ہے۔ اگر مضمون کی طوالت کا اندیشہ لاحق نہ ہوتا تو یہاں اس کی چند مثالیں بھی دی جاسکتی تھیں۔ اہم بات یہ ہے کہ گہرائی کے لیے پیچیدہ اور دقیق طرزِ اظہار ضروری نہیں۔ مولانا نے تاریخ، تہذیب و فلسفہ ہی نہیں بلکہ قانون معاشیات، دینیات و سیاسیات کے علاوہ دیگر کئی اہم شعبوں میں بڑی قیمتی کتابیں لکھیں اور ان کی نظری و عملی کاوشوں کے ذریعے اسلامی اجتماعیات کا ایک پورا دبستان ہی وجود میں آ گیا ہے۔

سرور صاحب کا آخری ارشاد یہ ہے کہ:۔

مولانا کی فکر میں ایک کٹّر پن ہے۔ وہ اجتہاد کی ضرورت سے تو انکار نہیں کر سکتے مگر اس پر ایسی پابندیاں ضروری سمجھتے ہیں کہ اجتہاد کی نوبت ہی نہ آ سکے۔

مولانا مودودی خاندانی خصوصیات کے لحاظ بھی ایک اعلیٰ معیار کے انسان تھے، پھر اُن کی نوجوانی حیدرآباد جیسے ایک علم وتہذیب کے شہر میں گزری۔ یہاں بڑے بڑے صاحبانِ علم وفن کے ساتھ اُن کا رابطہ رہا۔ آصف جاہی سلاطین کی طرزِ حکومت سے حیدرآباد میں ایک نہایت اعتدال پسند معاشرہ وجود میں آ چکا تھا۔ ہندوستان کے دوسرے شہروں سے لوگ یہاں چلے آتے تھے اور اُن کے لیے یہی پُرامن و اعتدال پسندی کی فضا وجہ کشش ہوا کرتی تھی۔ ایسے خوشگوار ماحول میں مولانا کی تعلیم و تربیت ہوئی اور اُنہوں نے اپنی زندگی کا ایک تہائی سے زائد حصہ یہاں گزارا۔ بھلا ایسی شخصیت کے فکر میں کٹر پن کیسے پیدا ہوسکتا ہے۔ مولانا کی فکر میں اصابت و استقامت تو بہت ہے لیکن تنگ نظری و کٹر پن کا کہیں گزر نہیں۔ اُن کی سیرت وسوانح نگاروں نے اس قسم کا کوئی اعتراض اُن پر نہیں کیا۔

اب رہا اُن کے نظریۂ اجتہاد کا مسئلہ۔ سچ تو یہ ہے کہ سرور صاحب اسلامی آئیڈیالوجی کے آدمی نہیں۔ ملازمتِ درس تدریس میں اُن کی تمام عمر کٹی، ادبیات میں ان کا مطالعہ وسیع لیکن تجربہ بہت محدود ہے اور وہ کسی

وسیع موضوع کو قابو میں لانے سے بالکل عاجز نظر آتے ہیں۔ علاّمہ اقبال پر اور مولانا مودودی کے متعلق جو کچھ انھوں نے اس مضمون میں لکھا ہے، وہ سب مہمل ہے۔ سرور صاحب کے علاوہ مسلمانوں کا موجودہ تجدّد پسند طبقہ یہ چاہتا ہے کہ اسلامی قانون میں ایسی تبدیلیاں کر دی جائیں کہ وہ زمانہ حاضرہ میں مغربی و مادی افکار سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اس طبقے کا سارا زور اِس بات پر بھی ہے کہ مسلمانوں کو موجودہ زمانے کے چوکھٹے میں بٹھا دیا جائے۔ ظاہر ہے اس قسم کے فتنہ خیز ماحول میں مولانا جیسا ایک عالم ربّانی اُمت کو ان تمام جاہلی میلانات سے بچانے کی کوشش کرے گا۔ تعجب یہ ہے کہ جو طبقہ Adjustment چاہتا ہے، اُس کو اجتہاد کی بڑی فکر لاحق ہے۔ حالانکہ اجتہاد تو اسلامی انقلاب کے لیے ضروری ہے۔ علاّمہ اقبال جو خود اجتہاد کے بڑے داعی تھے، اس راہ کی مشکلات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بھی اس معاملے میں سلفِ صالحین کی احتیاط پسندی کی اس طرح تائید کی تھی کہ:۔

> یہ ایک طبعی امر تھا کہ سیاسی زوال وانحطاط کے اس دور میں قدامت پسند مفکر اپنی ساری کوشش اس بات پر مرتکز کر دیتے کہ مسلمانوں کی حیاتِ ملی ایک یک رنگ اور یکساں صورت اختیار کر لے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ان میں مزید انتشار پیدا نہیں ہوگا۔ اُنہوں نے اس کا تدارک اس طرح کیا کہ فُقہائے متقدمین نے قوانین شریعت کی تعبیر جس طرح کی تھی اس کو جوں کا توں برقرار اور ہر قسم کی بدعات سے پاک رکھا۔

(''الاجتہاد فی الاسلام''۔ ''خطبات اقبال: نئے تناظر میں'' از محمد سہیل عمر (لاہور، ص ۱۸۸)

چنانچہ یہی موقف مولانا مودودی علیہ رحمۃ کا تھا اور یہی اسلامی دانشوری کا تقاضائے عصر بھی۔

سرور صاحب نے اپنے اس طویل مضمون کو مشہور ادیب محمد حسن عسکری کے تذکرے پر ختم کیا ہے۔ اس کے آخری پیرا میں اپنے تصوّراتی دانشور کی تصویر یوں کھینچی ہے:

> دانشور وہ ہے جو اپنی بصیرت سے زندگی میں پُرسوز عقلیّت پیدا کرے۔ سچا دانشور صرف گفتار کا غازی نہیں ہوتا، وہ کردار کا غازی بھی ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی اس راستے پر چلنا سکھاتا ہے۔ دانشوری صرف روشنی دکھانے کا نام نہیں، عمل کی راہیں روشن کرنا بھی ہے۔ دانشوری بھی ایک جہاد ہے۔ گفتار و کردار میں مناسبت نہ ہو، علم اور عمل ساتھ ساتھ نہ چلیں تو دانشوری صرف ایک شہاب ثاقب ہے، جو کچھ دیر اپنا جلوہ دکھا کر فضا میں غائب ہو جاتا ہے۔

اس تخیلی حسین تصویر کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو صرف علامہ اقبال اور مولانا مودودی ہی کی شخصیات میں یہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

حواشی

۱۔ سرور، آل احمد، ہفتہ وار کالم ایوان ادب، روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد دکن۔

۲۔ ایضاً

۳۔ صدیقی، ڈاکٹر رضی الدین، اقبال کا تصور زمان اور دوسرے مضامین، ناشر مجلس ترقی ادب، لاہور، (مقالہ مذہب و سائنس اقبال کی نظر میں)

۴۔ سرور، آل احمد، حوالہ مذکور دیکھیے نمبر ا

۵۔ ایضاً

۶۔ تاج، تصدق حسین (مرتب) مضامین اقبال، دارالاشاعت حیدرآباد دکن، ص ۱۹۲۔

۷۔ سرور، آل احمد، حوالہ مذکور دیکھیے حوالہ نمبر ا

۸۔ ایضاً

۹۔ برنی، مظفر حسین (مرتب) کُلّیات مکاتیب اقبال، اردو اکادمی دہلی (علامہ اقبال کا آل احمد سرور کے نام خط)

۱۰۔ تاج، تصدق حسین (مرتب) مضامین اقبال، ص ۱۹۲۔ حوالہ مذکور۔

۱۱۔ عزیز احمد، ہندوستان میں اسلامی جدیدیت: مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۲۶۷۔

۱۲۔ سرور، آل احمد ایضاً حوالہ مذکور، ہفتہ وار کالم ایوان ادب روزنامہ ''منصف''۔ حیدرآباد